ڈاکٹر تحسین بی بی

تقسیم ہند کے بعد احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں سیاسی شعور کے عناصر

احمد ندیم قاسمی اردو ادب کا ایک روشن مینار ہیں۔ انھوں نے ارتقا کی جتنی منزلیں طے کیں کم ہی افسانہ نگار اس مقام تک پہنچ پائے ہیں۔ آپ نے ادب کی دنیا میں جب قدم رکھا تو وہ ہندوستان میں سیاسی ابتری اور افراتفری کا دور تھا۔ جہاں آزادی کی تحریکیں پورے زور وشور سے اپنے عروج پر ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک نے ادب میں شخصی و سیاسی آزادی، معاشی مساوات اور جمہوری نظامِ عدل کے قیام کا نعرہ بلند کر رکھا تھا۔ ان حالات میں ندیم بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور ان کا اس تحریک کے ساتھ ایک مضبوط تعلق پاکستان بننے کے بعد قائم ہوا یوں ان کے ہاں کھل کر ترقی پسند تحریک کے سبھی رجحانات بیدار ہو گئے۔ پاکستان میں ندیم ترقی پسند تحریک کے اعلیٰ منصب دار رہے۔ انھوں نے تحریک کو آگے بڑھانے اور اسے مستحکم کرنے کے لیے جلسے جلوس اور احتجاج تک میں شرکت کی۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں اردو افسانہ کی پوری روایت جو قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوئی مگر تقسیم ہند کے بعد یہ روایت اور زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔ ندیم کے افسانے استعمار دشمن رویوں، امن وانسانیت کے تصورات کے پرچار اور ترقی پسند سیاسی شعور کی فضا کے حقیقت پسندانہ ترجمان ہیں۔ ندیم ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں، ان کی نظر بالعموم زندگی کی بنیادی اقدار اور صداقتوں پر ہوتی ہے جن کو وہ تخلیقی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ندیم کا فن ترقی کی منازل طے کر کے عروج پر پہنچ گیا۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''تقسیم کے بعد قاسمی کی افسانہ نگاری کا دور عروج شروع ہوتا ہے۔ جس زمانے میں ہمارے بیش تر افسانہ نگار یا تو خاموش ہو گئے یا تجربات کا خزانہ خالی ہو جانے کی وجہ سے ان کی تحریروں پر زوال آ گیا۔ احمد ندیم کی افسانہ نگاری ٹھیک اسی زمانے میں اپنے بلوغ کو پہنچتی ہے۔''[1]

احمد ندیم قاسمی وہ افسانہ نگار ہیں جن کا فن قیام پاکستان کے بعد زیادہ نکھر کر سامنے آیا۔ تقسیم کے بعد کے کرب ناک حادثات نے ندیم کے احساسات کو بری طرح متاثر کیا۔ اس دور میں ندیم کے افسانوں کا خاص موضوع اگر ایک طرف بے جا سماجی و سیاسی پابندیوں، طبقاتی تضادات، مفلسی، ظلم واستحصال اور زمین داروں، وڈیروں کی عیش پرستی کے خلاف کھلا احتجاج تھا، تو دوسری طرف وہ معاشی ناہمواریاں ہیں جن کا سامنا ہمیں

قدم قدم پر کرنا پڑتا ہے اور جس کے سبب ظلم وستم کے گھناؤنے چہرے اپنا بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جسے سیاست اور مذہب کے ٹھیکے دار ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوا دیتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دیہاتی اور شہری زندگی کے مسائل معاشرے کی اخلاقی حالت، ملکی سیاست، پس ماندہ طبقے کی عکاسی اور اس سے متعلق محرکات بھی ندیم کے افسانوں کے محور ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''موضوعات کے اعتبار سے اس (ندیم) کی افسانہ نگاری ایک اتھاہ سمندر ہے، وہ ایک بڑا افسانہ نگار ہے جس کا فن اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد ہے۔''[۲]

برصغیر کی تقسیم کے بعد ندیم نے نہ صرف فسادات اور جنگ وجدال پر لکھا بلکہ طبقاتی تقسیم، ظاہری نمود ونمائش اور انسانی منافقت کے حوالے سے ان کے افسانے کا خصوصی موضوع بنے۔ تقسیم ہند کے وقت فسادات کی گرد نے پورے اردو ادب بالخصوص اردو افسانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اس المیے کو جہاں دوسرے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا وہاں ندیم کا نام سرفہرست ہے۔ ندیم بنیادی طور پر امن پسند ہیں۔ آزادی کے دنوں میں پیدا ہونے والے حالات اور اس سے پہلے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے علاوہ دوسری جنگ عظیم وغیرہ نے بھی ان پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ انھیں اثرات کے تحت ندیم کے آزادی کے بعد منظر عام پر آنے والے افسانوں میں جنگ وفساد، امن وامان، مذہبی تفریق، قتل وغارت کا المیہ، تشدد، سیاسی لیڈروں اور مہاجنوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ندیم کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آس پاس'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانے ''افق''، ''تکمیل'' اور ''ارتقا'' ندیم کے سیاسی شعور اور حب الوطنی کا کھلا ثبوت ہیں۔

افسانہ ''افق'' میں ندیم نے آزادی کے لیے جدوجہد کے تصور کو ابھارا ہے۔ یہاں ندیم پاکستان کے متعلق خواب گری کا کام کرتے ہیں۔ اس افسانہ میں چار کردار مصور، شاعر، موسیقار اور فلسفی آپس میں دوست ہوتے ہیں۔ جو اندھیرے سے روشنی کی طرف سفر کر رہے ہیں اور سفر کے دشوار وکٹھن مراحل کے دوران ایک دوسرے کی ہمت بڑھا رہے ہیں:

''۔۔۔ ہمدمو! دیکھو، الاؤ کا دائرہ لرز رہا ہے اور ستارے ڈوبے جا رہے ہیں۔ رات کا نظام زوال پذیر ہے، اب اس تخریب سے ایک نئے روشن نظام کی تعمیر ہوگی۔''[۳]

ندیم نے ان چاروں کرداروں کو بطور علامت استعمال کیا ہے اور وہ اپنی قوم سے یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ تم جنگوں، خطوں اور بداخلاقیوں کو نہیں روک سکتے ہو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ ایک نقرئی قوس ہماری منتظر ہے اور اس ہلکے سے دھندلکے کے پیچھے جھانکتی افق ہمارے انتظار میں ہے۔ ندیم قوم کو یہ یقین دلاتا ہے کہ ان کی منزل انھیں ملے گی، چاہے وہ دور ہے یا نزدیک ہے:

''کون جانے کہ منزل دور ہے یا کتنی قریب، تم بھی نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتا، لیکن اس حقیقت سے تمھیں بھی انکار نہیں مجھے بھی انکار نہیں، کسی کو بھی انکار نہیں کہ منزل ہے ضرور۔''[۴]

افسانہ ''تکمیل'' میں ندیم نے انگریز سامراج کے ہندوستان پر قبضے اور اس سامراجی حکومت کی من مانیوں کو بیان کیا ہے کہ وہ کس طرح ہندوستان کے عوام پر اپنی سلطنت کا سکہ جمائے بیٹھی ہے اور ہندوستانی عوام کو اپنا غلام بنا کر حکمرانی کر رہی ہے۔ اب اس کا زعیمِ تسلط اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ اسے ہندوستانی عوام کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔

''ہماری تمھاری کون سنتا ہے اس زمانے میں جب کہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی کوئی نہیں سنتا۔ جانتی ہو انگریز ہمارا حاکم کیوں ہے، تم نہیں جانتیں، بڑے بڑے عالم بھی نہیں جانتے کہ انگریز صرف اور صرف اس لیے اب تک ہمارا حاکم چلا آ رہا کہ وہ بہرہ ہے، وہ ہندوستانیوں کی کوئی بات نہ سن سکتا ہے، نہ سمجھ سکتا ہے۔''[۵]

افسانہ ''ارتقا'' میں ندیم نے چاند اور تارے کی علامت کا رخ محمد علی جناح کی طرف کر کے تحریک خلافت کو تحریکِ پاکستان سے مربوط کر دیا ہے۔ افسانہ ''ارتقاء'' کی تخلیق کا زمانہ ندیم کے ہاں عملی سیاست میں شدید ترین انہماک کا زمانہ ہے۔ اس افسانے میں ندیم نے تحریک خلافت کی ساری روداد کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ تحریک چلنے پر اور اس کے اختتام پر لوگوں کے جذبات و احساسات اور اس کے اثرات کیا تھے۔ ندیم کا بیانیہ جس طرح محمد علی جوہر کی جگہ محمد علی جناح اور خلافت کے چاند تارے کی جگہ پرچم ستارہ و ہلال لے آتا ہے، اس سے ندیم کا نقطۂ نظر ابھر کر سامنے آتا ہے، کہ تحریکِ خلافت نے ہی وہ سیاسی بنیاد فراہم کی تھی جس کے نتیجے میں تحریک پاکستان کی عمارت تعمیر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ بقول محمد عباس طوروی:

''خلافت کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرتا بوڑھا افسانے کے دوسرے حصے میں پاکستان کے قیام کے لیے مجسم دعا ملتا ہے۔''[۶]

افسانہ ''ارتقاء'' میں ندیم نے برصغیر میں مسلم قومیت کے احساس کے ارتقا کی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔ افسانہ شروع سے آخر تک سیاسی شعور کا بہترین نمونہ ہے۔ جس میں تاریخی اور سیاسی حقائق واضح ہوتے ہیں۔ اس افسانے کے متعلق فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

''تحریکِ خلافت ندیم کے ہاں اس مقدس آگ کی صورت میں جلوہ گر ہے، جو کبھی بجھائی نہ جا سکی۔ انگریز کے سیاسی و معاشی استبداد نے جب گلی، بازار اور کھیت کھلیان میں اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا تو یہ جانبازوں کے دلوں میں دہکنے لگی۔ افسانہ ''ارتقاء'' میں یہ آگ نسل در نسل منتقل ہوتی نظر آتی ہے اور اس تحریک کے زیرِ اثر تحریکِ خلافت پاکستان بنتی دکھائی دیتی ہے۔''[۷]

ندیم تحریکِ پاکستان کا سبز پرچم بلند کیے جس علاقے میں سرگرم عمل تھا، وہ علاقہ انگریزوں کے خوشامدی سفاک ترین جاگیرداروں کا گڑھ ہونے کے علاوہ پنجاب کے متکبر حکمران کا حلقۂ انتخاب بھی تھا۔ اس استبداد کی روز بروز بڑھتی لہر کے باوجود ندیم کو انگریز سامراج کی شکست اور جاگیرداری استحصال کی موت ناگزیر معلوم ہوتی تھی۔ ندیم نے جنگ عظیم کے بعد کے سیاسی حالات و واقعات کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے فسادات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ندیم نے فسادات کے ہول ناک المیے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر جو کچھ پیش آیا اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''منٹو اور احمد ندیم قاسمی نے اس زمانے میں فسادات پر بعض بہت اچھے افسانے لکھے اور ان فسادات کے پیچھے جن طاقتوں کا ہاتھ تھا انھیں اپنے افسانوں کے ذریعے سے بے نقاب کیا۔''۸

ندیم کے افسانوی مجموعہ ''درودیوار'' میں شامل افسانوں کا موضوع فسادات یا آزادی کے بعد کی صورت حال ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ ''میں انسان ہوں'' میں ندیم نے فسادات کے المیے کو بیان کیا ہے۔ فسادات کی وحشت و بربریت نے جب صبح آزادی کو دھواں دھواں کر دیا تھا۔ ندیم کے ہاں رجائیت میں بھی کہیں کمی نظر نہیں آتی۔ ندیم نے فسادات کی تمام ذمہ داری پسپا ہوتے ہوئے برطانوی سامراج پر ڈال دی۔ ندیم نے فسادات کے موضوع پر لکھتے ہوئے کبھی ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے نہیں دکھایا، بلکہ اسے آزادی سے تعبیر کیا۔ جس کی مثال افسانہ ''نیا فرہاد'' ہے۔ اس افسانے میں ندیم نے فسادات کے ہول ناک واقعات کی تصویر کشی نہایت خوبی سے کی ہے کہ جب پرامن گاؤں میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور گاؤں والے ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کرنے پر تلے ہوتے ہیں، افسانے کا مرکزی کردار اپنے مسلمان ساتھیوں کو اس بربریت سے روکتا ہے اور یوں ہندو اور سکھ وہاں سے بحفاظت نکلنے میں کامیاب رہتے ہیں:

> ''یہ انگریز کی چال ہے۔ اگر یہ اس کی چال نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ذیلدار، نمبردار، کرسی نشین اور سفید پوش سب کے سب اپنی چوپالوں پر بیٹھے حقے گڑگڑا رہے ہیں اور پنڈلیاں دبوا رہے ہیں اور ہم غریب سکھوں اور ہندوؤں کے سینوں میں چھرے گھونپ گھونپ کر اسلام کا نام اونچا کر رہے ہیں۔''۹

افسانہ ''تسکین'' اس الم ناک صورت حال کا غماز ہے، جو آگ اور خون کے سمندر عبور کرنے والوں کے لیے اپنوں نے پیدا کر رکھی تھی۔ اس افسانے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مہاجرین کی حالت زار اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کی عکاسی نہایت خوب صورتی سے کی گئی ہے۔ مہاجرین کے ازالے کے لیے ان کو جھوٹی تسلیاں دے کر منافقانہ عمل سے انھیں مزید دکھ دیے گئے ہیں کیوں کہ بقول راؤ صاحب:

''یوں نہ کیا جاتا تو یہ ہر روز آپ کو تنگ کرتے رہتے۔ یہ سب کچھ بے چاروں کی تسلی ہی کے لیے ہو رہا ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ ان حالات میں کون جا سکتا ہے وہاں۔۔۔''[۱۰]

۱۹۴۷ء کے واقعات کے متعلق ندیم کے افسانوں میں ایک اہم افسانہ ''جب بادل اُمڈے'' بھی شامل ہے اس افسانے میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی روداد کے ساتھ ہی یہاں ایک مہاجر دہقان کی بحالی و آبادکاری کی سرگزشت کو بیان کیا گیا ہے۔

افسانہ ''جب بادل اُمڈے'' تقسیم ہند اور پاکستان کی تشکیل کے فوراً بعد کے ماحول کے ایک اہم پہلو کو عیاں کرتا ہے، جس میں پرانی اور نئی قدروں کی کش مکش کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ وہ جاگیرداری نظام جو برسوں چلا آ رہا تھا ختم نہیں ہوا۔ اور طبقاتی زندگی کے تصادم بھی اسی کے ساتھ سر اٹھاتے ہیں۔ ایک طرف جاگیردارانہ نظام، اس کی فرسودہ روایات، اس کی کھوکھلی رعونت اور خباثتیں ہیں تو دوسری طرف پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد آزادی کا تازہ احساس، اپنے حقوق حاصل کرنے کی لگن اور جدوجہد ہے۔ ندیم نے اس کش مکش میں صدیوں پرانے جاگیرداری نظام کے ظلم وستم اور جاگیرداروں کی خباثتوں کی تاریخ کو بیدار کر دیا۔ افسانے کی مجموعی فضا سے ظاہر ہے کہ اب محنت کش طبقہ اپنے حقوق کے لیے مل کر آواز اٹھا سکتا ہے۔ افسانے کی فضا سے ظاہر ہے کہ غریب طبقہ اب بے دار ہو چکا ہے اور اب اس طبقے کو آسانی سے نہیں دبایا جا سکتا اور نہ ہی اپنے اشاروں پر چلایا جا سکتا ہے۔ یہ پیغام ندیم، مہاجر دہقان کی زبانی ہم تک پہنچا رہے ہیں کہ:

''مجھے معلوم نہ تھا کہ پاکستان بھی اپنے اندر آپ ایسے پھوڑے چھپائے بیٹھا ہے اور جاگیردار جی اگر پاکستان کو زندہ رہنا ہے تو اسے یہ پھوڑے کاٹ کر پھینکنا پڑیں گے۔''[۱۱]

افسانہ ''سپاہی بیٹا'' جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں اور انگریزوں کی مکاری ظلم وستم اور غریب ہندوستان کی مجبوریوں، غربت وافلاس کا احاطہ کرتا ہے اور یہی غربت وافلاس سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ ان نوجوانوں کو فوجی بھرتی پر آمادہ کرتا ہے:

''وہ نوجوان جو اپنے کھیتوں کے تنہا رکھوالے تھے، نالائی کے بہانے گھروں سے نکلے اور ہلوں اور بیلوں کو کھیتوں میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہفتوں کے بعد سکندر آباد لکھنؤ سے ان کی چٹھیاں آئیں کہ وہ ماں باپ اور بہن بھائی کو فاقوں سے مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں۔''[۱۲]

یوں اس غربت وافلاس سے چھٹکارا پانے کے لیے یہ نوجوان خوشی خوشی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو تباہی اور موت کے غار میں دھکیل دیتے ہیں کیوں کہ اگر وہ میدان جنگ میں ہلاک ہو جائیں تو ان کے وارثوں کو پنشن بھی ملتی ہے۔ افسانہ ''سپاہی بیٹا'' میں ندیم نے پنجاب کے دیہاتوں میں انگریزوں کی جبری

بھرتی کے عمل کی روداد بھی بیان کی ہے۔ بقول فتح محمد ملک:

''انگریز نے جبری بھرتی کی مہم کے دوران پنجاب کے دیہات پر جو ظلم توڑے، ان کا اندازہ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے ذمہ دار گورنر سر مائیکل اڈوائر کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے، ''پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ چاہییں۔'' اگر خوشی سے بھرتی نہیں ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کرلیں گے۔''[۱۳]

اس افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

''اس افسانے میں رقت تو ہے مگر کاسہ لیسوں اور مفاد پرستوں کے ارباب اختیار سے گٹھ جوڑ کا نقشہ دل چسپ انداز میں کھینچا گیا ہے۔''[۱۴]

ندیم نے اپنے افسانوں میں ظلم وستم کا شکار ہونے والے پامال دیہاتی کی سسکیوں اور آہوں کو جذباتی سطح پر محسوس کر کے اس کا لفظوں میں اظہار کیا ہے۔ ندیم کے دیہاتی غریب کسان اور محنت کش اپنی بے بسی، غربت اور جاگیرداری کی چکی کے دو پاٹوں میں بہت دیر تک پستے ہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کی خودی بیدار ہو جاتی ہے اور وہ اب بے بس و بے یار و مددگار نہیں رہتا بلکہ روڑا بن جاتا ہے اور پھر جاگیردار کی چکی میں پسنے سے انکار کر دیتا ہے۔ افسانہ ''ووٹ'' اور افسانہ ''کہانی لکھی جارہی ہے'' اس انداز کی عمدہ مثالیں ہیں کہ ان افسانوں کا بے زبان آہستہ آہستہ زبان میں گویائی اور گویائی میں قوت وتوانائی پیدا کرتا جاتا ہے۔

ندیم کا سیاسی شعور سے منور افسانہ ''ووٹ'' عوام دوستی اور سامراج دشمنی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس افسانے میں ندیم نے عالمی سامراج، اس کے مقامی حلیفوں اور ان کے گماشتوں کے ظاہری و باطنی رشتوں کو بڑی خوب صورتی سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جاگیرداری نظام کے ظالمانہ رویوں کی عکاسی کی ہے۔

ندیم نے نئے ملک کے متعلق جس طرح کے خواب دیکھے کہ وہاں کا معاشی اور سیاسی نظام تبدیل ہوگا اور غریبوں و محنت کشوں کو ان کے تمام حقوق ملیں گے لیکن قیام پاکستان کے بعد بھی سابقہ استحصالی طبقہ حکمران رہا اور جاگیردار، سرمایہ دار، سرکاری اہلکار سب پہلے انگریزی حکومت کے خیر خواہ تھے تو اب اپنی تمام وفاداریاں پاکستان کے ساتھ جتا کر صرف اپنے مفادات سے غرض رکھتے ہیں۔ نیا ملک بن جانے کے بعد بھی جب ملک کی سیاسی صورت حال وہی رہی اور ملک کی باگ ڈور انھیں مفاد پرست لیڈروں کے ہاتھ میں رہی تو ندیم نے اس سیاسی صورت حال کا حوالہ افسانہ ''ووٹ'' میں یوں بیان کیا:

''پاکستان بننے کے بعد ملک صاحب کے بنگلے پر اتنا اونچا جھنڈا نصب کیا گیا کہ کوؤں، چیلوں اور چڑیوں نے کچھ دن کے لیے ادھر آنا تک چھوڑ دیا تھا اور آج ملک صاحب پاکستان کے بہت بڑے خیر خواہوں میں گنے جاتے ہیں۔''[۱۵]

اس کے ساتھ ہی افسانے میں عوامی بیداری، تبدیلی کی آرزومندی اور انقلاب کے آثار بھی واضح

نظر آتے ہیں۔ کہ اب کسان اور محنت کش اپنے حقوق کے لیے جاگیردار اور استحصالی سامراج کے مدمقابل آ کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ ایک غلط ووٹ کے لیے روپیہ پیسہ، دھونس سے متاثر ہونے کے بجائے کسان کمیٹی کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اسی لیے جاگیردار کا کارندہ آخر میں یہ کہہ اٹھتا ہے:

''اگر ہم کچھ اپنے ساتھ لائے ہیں تو وہ ایک لرزہ ہے، ایک کپکپی ہے اور یہ یقین کہ یہ ہمارے ملک صاحب کا آخری الیکشن ہے۔ یہ ہمارے ہدایت اللہ کی آخری دلالی ہے اور دوستو! ان زمینوں پر تمھاری یہ آخری سواری ہے۔''[۶]

افسانہ ''کہانی لکھی جا رہی ہے'' بھی اسی کیفیت اور تاثر کا حامل ہے۔ اس افسانے میں ندیم نے ایسے بے بس کسانوں پر جاگیرداروں کے ظلم وستم کی داستانوں کو بیان کیا ہے جو اپنا حق مانگتے ہیں اور افسانے کے آخر میں ندیم نے نچلے طبقے کے مزارعوں و کسانوں کے جوش کو ایک انقلابی انداز میں پیش کیا ہے:

''یہ ایک امڈتا ہوا ہجوم تھا، لوگوں کے ہاتھوں میں کدالیں اور پھاوڑے اور درانتیاں اور کندھوں پر ہل تھے۔۔۔ سب سے آگے عورتیں تھیں، ان کے پیچھے نوجوان تھے، کہیں کہیں بوڑھے بھی نظر آ جاتے تھے جو اپنی سفید داڑھیوں کے باوجود جوانوں کی تیز رفتاری کا ساتھ دے رہے تھے، ان کے چہروں اور سینوں پر پسینے کے موتی تھے اور ٹانگوں پر اُڑتی گرد جم رہی تھی اور وہ اپنا حق مانگنے کے بجائے چھیننے نکلے تھے۔ دھرتی کو آباد کر کے خود اجڑے رہنا انھیں اب قبول نہ تھا۔''[۷]

یہاں پر افسانہ ایک اجتماعی تحریک کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ظالم جاگیرداروں اور حکمرانوں کی من مانیوں کے خلاف اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے نچلا طبقہ اجتماعی صورت میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''درودیوار'' میں ندیم کا آخری افسانہ ''راجے مہاراجے'' ایک تمثیلی افسانہ ہے۔ جس میں جنگ کو سامراجی نظام کے ساتھ ساتھ سیاست و معیشت کا ناگزیر نتیجہ بتایا گیا ہے۔ یہ افسانہ معاصر عالمی سیاست کے پس منظر میں بڑی طاقتوں کے درمیان مفادات اور تضادات کے رجحانات کو نمایاں کرتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بوڑھی استانی مادر انسانیت کا استعارہ ہے، تو دوسرے کرداروں میں مکی (امریکہ) ولی (برطانیہ) اور خلوف (روس) ہے، جو استانی کو اپنے جھگڑوں اور آپس کے تضادات و مسائل کو حل کروانے کے لیے اسے نیند سے بیدار کرتے ہیں۔ مگر ان میں اختلافات بڑھ جاتے ہیں اور ہر کوئی اپنے مفاد کی غرض کے لیے دوسرے کو الزام دیتا ہے اور تینوں اپنی اپنی ملوکانہ اغراض کی خاطر چاند کی سیاست کے تمنائی ہیں جب کہ استانی جس کو وہ سب ماں کہہ کر پکارتے ہیں وہ انھیں چاند کے بجائے زمین کی الم ناک سرگذشت سناتی ہے۔ اس کہانی کے درمیان میں پورب کے ایک لڑکے کی خطابت مصنف کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے:

''یہی پورب آج مکی اور ولی کی تجربہ گاہ کیوں ہے ماں؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ لوگ اسی تہذیب

کا آج مذاق کیوں اڑاتے ہیں اور یہاں کے بچوں کے سوا نہیں توپوں کا ایندھن اور کہیں کیوں نہیں ملتا؟ ماں! کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ایٹم بم کا تجربہ پورب والوں پر کیوں ہوا۔ کیا پچھم میں کوئی دشمن نہ تھا؟''[۱۸]

اس افسانے کے اختتام پر ایشیا اور افریقہ کے محکوموں میں بیداری کے آثار ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''درودیوار'' میں تقسیم ہند کے بعد فسادات، ہجرت کا المیہ اور آزادی کے بعد سیاسی وسماجی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ جاگیرداری، گماشتہ سرمایہ داری، سول اور فوجی افسر شاہی کے خلاف پنجاب کے پس ماندہ مفلس کسانوں مزارعوں اور اور مزدوروں کی حمایت ندیم نے نہایت خوبی سے کی ہے اور ان تمام مسائل کا حل تصوریت پسندی کے بجائے اشتراکیت میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ندیم کے افسانوی فن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بنگال کا قحط زمانہ جنگ کی ہولناکی، تقسیم ہند کی انسان کشی، پاکستان کی افراتفری ہر موضوع کے حال و مستقبل کا انحصار ہے۔''[۱۹]

پاکستان کو شروع ہی سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک ترقی پذیر ملک کو ترقی کے ذرائع اختیار کرنے میں جو مسائل پیش آئے اُن کے ساتھ ساتھ ملک میں رائج قبائلی، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظاموں کے سارے تضادات جب سیاسی بازی گری کے اثر سے رونما ہوتے ہیں تو بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے سیاسی شعور کی بڑائی یہ ہے کہ وہ انتہائی تاریکی میں بھی مایوس نہیں ہوتے انھوں نے اپنے فن کے ذریعے زندگی کی روشنی کے اظہار، جمہوریت کے اثبات اور سیاسی تہذیبی عناصر کی تشکیل کی۔ ان کی فکر امید کا پیغام دیتی ہے۔

آزادی سے متعلق تحریک پاکستان کے رہنماؤں نے جب قیام پاکستان کے مقاصد بیان کیے تھے تو مسلمانوں کی اکثریت نے اس کا خیر مقدم کر کے ایک ایسی آزاد ریاست کا تصور اتی خاکہ میں تیار کیا تھا جس میں جمہوری نظام، انصاف، برابری، آزادی اور خوش حالی ہوگی لیکن بدقسمتی سے سب کچھ اس کے الٹ ہوا یعنی آزادی کے ساتھ ہی لوٹ مار، سیاسی کشمکش اور اقتدار کی چھینا جھپٹی کا تماشا اس قوم کا مقدر بن گیا۔ ان تمام سیاسی حالات وواقعات کا تذکرہ ندیم نے اپنے افسانوی مجموعہ ''سناٹا'' ۱۹۵۲ء میں شامل افسانے ''سناٹا'' میں نہایت خوبی سے کیا ہے، یہ ندیم کا ایک بے مثال افسانہ ہے، جہاں اُن کے سیاسی نظریات اور زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں۔ یہ ایک ایسے اجڑے کنبے کی داستان ہے جو انبالہ میں آسودہ تھا لیکن تقسیم ہند کے بعد دکھوں اور مصیبتوں کے لامتناہی چکر میں پھنس کر رہ جاتا ہے مصائب و آلام کے پہاڑ تلے دبے کنبے خارجی اور داخلی

دھماکوں اور دھچکوں سے کس طرح ٹوٹتے ہیں اس کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے جس میں ''کلثوم'' کا کردار پاکستانی استحصالی عوام کی علامت بن کر ابھرتا ہے اور اس کی ماں وہ حکمران طبقہ ہے، جو جمہوری اقدار کے خلاف فیصلے کر کے عوام کو بے جا سماجی پابندیوں اور معاشی کشمکش میں مبتلا رکھتا ہے۔

افسانہ ''سناٹا'' کا بنیادی خیال دراصل قیام پاکستان سے مستعار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور اس کے بعد تنظیم پاکستان کے سلسلے میں سر ابھارنے والی سیاسی کشمکش کے پس منظر سے آگاہی رکھتا ہے تو وہ بلا جھجھک افسانے کی بلیغ ایمائیت واشاریت میں چھپی سیاسی جہتوں کو پہچان سکتا ہے۔ اس افسانے کی سیاسی جہت کے حوالے سے لبنیٰ انصاری لکھتی ہیں:

> ''قاسمی نے اس افسانے کے ذریعے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ ادب اپنے قاری میں سیاسی وسماجی شعور کی بیداری کا ذریعہ تو ہے لیکن سیاسی محاذ آرائی کا وسیلہ ہرگز نہیں۔''[۲۰]

ندیم نے اردو ادب بالخصوص افسانہ اور نظم میں پاکستان اور پاکستانیت کے مفہوم کو بھرپور انداز سے اجاگر کر کے حب الوطنی کے جذبے کو تازہ رکھنے کی تلقین کی ہے۔ بقول ڈاکٹر شفیق انجم:

> ''احمد ندیم قاسمی کے افسانے ٹھوس بنیادوں پر اپنی پہچان کراتے ہیں۔ زندگی کے عمومی چلن کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ہر اہم سیاسی وسماجی واقعے پر انھوں نے کہانی لکھی۔''[۲۱]

افسانوی مجموعہ ''سناٹا'' میں شامل افسانہ ''بڑی سرکار کے نام'' میں ندیم نے ایک غریب مہاجر عورت کی داستانِ الم کو موضوع بنایا ہے۔ جو اپنی آنکھوں میں خواب بسائے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آتی ہے لیکن اسے اپنے خواب کی تعبیر نہیں ملتی۔ یہ افسانہ حکمران طبقہ کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ یہاں قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی سیاست میں جو شعبدہ بازیاں، رشوت اور خود غرضیاں سر اٹھا رہی تھیں اور حکمران طبقہ اپنی تجوریاں بھرنے میں لگا ہوا تھا سب کا پول کھل کر سامنے آتا ہے کہ وہ اس قدر عیش وعشرت میں مگن ہیں کہ غریب عوام کا کوئی آسرا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ نہ اپنے حقوق کے لیے اپنے لب کھول سکتے ہیں اور نہ انھیں اپنا دکھ درد کہنے کی اجازت ہے:

> ''میں جنم جلی تو سمجھی تھی، یہاں اپنا دکھ درد کہنے کی آزادی ہے۔''[۲۲]

افسانہ ''مامتا'' ندیم کے شاہکار افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جو دوسری جنگ عظیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے ماحول میں انسان اس قدر وحشت و بربریت، سفاکیت اور درندگی کی ہولناک پستیوں میں گر جاتا ہے کہ غالب قوت کے لیے مغلوب کی تباہی اور موت ایک لطیفہ بن کر رہ جاتی ہے۔ جس کی مثال اس طرح دی گئی ہے:

''ایک پنجابی کے پیٹ میں بم کا ایک سپلنٹر پیوست ہو گیا، انتڑیاں باہر نکل آئیں، موت کے کرب میں اس نے چند بل کھائے، تو اس کی انتڑیاں اس کی گردن میں پھنس گئیں اور ایک انگریز افسر نے بموں کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی تصویر اتاری۔''[۲۳]

ندیم نے افسانوی مجموعہ ''بازارِ حیات'' ۱۹۵۹ء میں شامل افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' فسادات کے پس منظر کے موضوع پر لکھا ہے۔ یہ ندیم کا نہایت موثر افسانہ ہے جسے فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ندیم کے افسانوں میں سے سب سے زیادہ شہرت ملی۔ ندیم نے اس افسانے میں ایک ایسے سکھ کا تذکرہ کیا ہے جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر ایک مسلمان لڑکے کو سرحد پار کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' میں اس کرب کو بیان کیا گیا ہے جو فسادات کے دوران اپنے پیاروں کو کھو دینے سے لواحقین کی روح کا حصہ بن جاتا ہے۔ پرمیشر سنگھ ان تمام الم زادوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کے پیارے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نذر ہوئے۔ ''پرمیشر سنگھ'' ایک ایسا افسانہ ہے، جس میں ایک باپ (سکھ) اپنے لختِ جگر کے بچھڑنے کے بعد دوسروں کے ایسے دکھ کو اپنا دکھ محسوس کرتا ہے۔ پرمیشر سنگھ کو ان فسادات کے دوران ایک ایسا بچہ ملتا ہے جو کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے اچانک سکھ کو خیال آتا ہے کہ مسلمان بچے کو سکھ بنا دینا زیادتی ہے۔ لہٰذا ایک روز اس بچے کو پاکستان پہنچانے کے لیے پاکستانی سرحد کی طرف روانہ ہوتا ہے اور بچے کو وہاں پہنچا کر واپسی کی راہ لیتا ہی ہے کہ اسے راستے میں خیال آتا ہے کہ اختر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ جب وہ سرحد کی طرف واپس مڑتا ہے تو اس کا سایہ دیکھ کر سپاہی للکارتے ہیں اور اس پر گولی چلا دیتے ہیں۔ وہ چیخ اٹھتا ہے:

''مجھے کیوں مارا تم نے میں تو اختر کے کیس (بال) کاٹنا بھول گیا تھا، میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا رے!''[۲۴]

ندیم کے افسانے پر ''پرمیشر سنگھ'' کے حوالے سے قیصر نجمی کہتے ہیں:

''قاسمی صاحب کے افسانہ نگاری کا کینوس بے حد وسیع ہے جو سماجی، معاشرتی، نفسیاتی، الجھنوں اور تقسیم کے بعد ہجرت سے پیدا ہونے والے متنوع مسائل پر محیط ہے۔ ان کے بیش تر افسانوں کو اعلیٰ ادبی شہ پاروں کا درجہ حاصل ہے۔ ان کا تحریر کردہ افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' کلاسیکی ادب میں شمار ہوتا ہے۔''[۲۵]

ندیم کے فن کی تہہ میں جن محرکات کی کارفرمائی ملتی ہے ان کا جائزہ لیتے وقت اس سیاسی شعور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو تاریخ کو جدلیاتی عمل، انسانی اعمال، طبقاتی آویزش اور ارتقائی منازل کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ ان کے یہاں معاشرتی اور اخلاقی زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست اور بین الاقوامی

محرکات کا پختہ رنگ ملتا ہے۔ کیوں کہ وقتی، ہنگامی اور سیاسی وسماجی موضوعات سے ندیم کا تخلیقی لگاؤ ہمیشہ جاری رہا ہے اور ندیم آزادی وصداقت کی اقدار سے وابستگی کے ساتھ ساتھ ہنگامی اور سیاسی موضوعات کو فن کے جمالیاتی تقاضوں کی آنچ میں ابدیت سے ہم کنار کر کے پیش کرنے میں ماہر ہیں۔

ندیم کے افسانوی مجموعہ ''برگِ حنا'' ۱۹۵۹ء میں شامل افسانہ ''وحشی عورت'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ جس میں ایک بڑھیا کی داستان بیان کی گئی ہے، جو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے بس میں سفر کرتی ہے تو کرایے کی کمی کی وجہ سے جب ایک سفید پوش بزرگ بڑھیا کا کرایہ کنڈیکٹر کو دیتا ہے جس کا بڑھیا کو پتا چلتا ہے تو وہ اس پر برس پڑی اور یہ کہتی ہوئی بس سے اتر جاتی ہے:

> ''اے سخی داتا کہیں کے! تو مجھ پر ترس کھاتا ہے جس نے ساٹھ ستر سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اگنے اور خوشوں کے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیئے ہیں، تو ان ہاتھوں پر چھے پیسے رکھ رہا ہے۔''[۲۶]

اس افسانے پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''سفید پوش'' بزرگ کے پیچھے پیسے، وائٹ ہاؤس کی اس معاونت وامداد کا استعارہ ہے جو ملکی سالمیت اور ملی سیاسی آزادی کی قیمتوں پر فارن ایڈ کے نام ہمیں مسلسل ملتی رہتی ہے اور ''بڑھیا'' اس ملّی تشخص کا استعارہ ہے جو اپنی نارسائی اور مجبوری کے آگے اپنی غیرت کو زندہ رکھتا ہے اور جو عزت نفس اور غیرت ملّی کی قیمت پر رحم کھا کر ملنے والی خیرات کو قبول نہیں کر سکتا۔ یوں یہ ''وحشی عورت'' اس ردِعمل اور احتجاج کی علامت ہے جسے انفرادی وملی سطح پر محسوس کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری افسانہ ''وحشی عورت'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''افسانہ کیا ہے قومی سطح پر ہمارے سیاسی وتاریخی شعور اور اس کے عمل وردعمل سے پیدا شدہ رجحان کا افقی خط ہے۔ جسے احمد ندیم قاسمی نے ''وحشی عورت'' کی زبان دے دی ہے۔''[۲۷]

ندیم نے اپنے افسانوں میں ایوب خانی آمریت کی سفاکیت اور شب وروز کی چکی میں پستے ہوئے افراد کے مصائب والم کے ساتھ ساتھ سیاسی عمل کے جبری تعطل کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ندیم کے افسانے فوجی آمریت کے اثرات اور سیاس وتہذیبی زندگی پر اقدار کے زوال کی داستانوں کے مرقعے ہیں۔ اس کی واضح مثال ندیم کا افسانہ ''کھمبا'' ہے۔ اس افسانے میں ایک طرف شیخ رفیع الدین کی گم نامی، بے توقیری اور اس کی کسمپرسی جذبہ حریت کے زوال کی علامت کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ تو دوسری طرف شیخ رفیع الدین قومی ملی سیاسی مسلک کی موت کا استعارہ ہیں۔ کیوں کہ جب حکمران طبقہ سلطانی جمہور کے سیدھے راستے سے بھٹک کر اندھی طاقت کی پرستش میں مبتلا ہوا تو اس کے نتیجے میں آزادی وخودمختاری کے

بارے میں دیکھے گئے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے اور معاشرے سے حق اور ناحق، جائز و ناجائز کی تمیز بھی اٹھنے لگی۔ غور کیا جائے تو ندیم اپنے دور کی بساطِ سیاست کی ہر نئی سامراجی چال کے دردمند شاہد اور ایک بے باک مبصر ہیں۔

ندیم کے ہاں گھریلو زندگی کے مسائل سے لے کر عالمی نوعیت کے مسائل اور مذہبی و سماجی تفریق غرض زندگی کے مختلف روپ نظر آتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''گھر سے گھر تک'' ۱۹۶۳ء میں شامل افسانے ''گھر سے گھر تک'' میں ندیم نے ایک متوسط طبقے کی اس ریاکاری کو نمایاں کیا ہے جو اب سماجی مجبوری بن چکی ہے۔ یہاں ندیم نے ایک بڑی معاشرتی کم زوری کا پردہ چاک کیا ہے جسے سرمایہ دارانہ نظام نے ابھارا ہے۔

ندیم کے افسانے پنجاب کی زندگی وہاں کے مسائل، وہاں کی زرعی و جاگیردارانہ معاشرت کے عکاس ہیں۔ ندیم نے جاگیردارانہ نظام کی کش مکش، کسان و جاگیردار کی جنگ کے ساتھ ساتھ ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کے رُخ سے نقاب اتار کر اس کی بہیمیت کو پیش کیا ہے۔ افسانہ ''اصول کی بات'' میں ندیم کا سیاسی شعور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس افسانے میں ندیم نے جاگیردارانہ نظام اور اس کی خباثتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور اس الم ناک احساس کو اجاگر کیا ہے کہ جاگیردارانہ معاشرے میں فرد کی نفی کس طریقے سے ہوتی ہے اور پھر ظلم کے خلاف اٹھی آواز کو استحصالی قوتیں نہ صرف دباتی ہیں بلکہ ان کے خلاف انتقامی کارروائی بھی کرتی ہیں۔

افسانہ ''اصول کی بات'' میں مزارع اور زمین دار کا رشتہ کچے دھاگے کی مانند ہے، جو فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔ یہاں ایک زمین دار جس کی حس مزاح کمزوروں کی عاجزی سے پروان چڑھتی ہے وہ اپنے درباریوں کے ساتھ چوپال میں بیٹھا ہے اور ایک مفلوک الحال کسان عبداللہ جس کو زمین دار نے ایک چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے سے بے دخل کر دیا ہے، ہاتھ جوڑے کھڑا احتجاج کر رہا ہے:

> ''تم اب تک یہیں کھڑے ہو؟ زمین دار نے پوچھا۔ جیسے وہ کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا۔ عبداللہ نے جواب میں جڑے ہوئے ڈھیلے ہاتھوں کو پھر سے اکڑا لیا۔''[۲۸]

ندیم کا یہ احتجاج ان کے مختلف افسانوں میں مختلف زاویوں سے سامنے آتا ہے۔ کبھی مزارع کی شکل میں، کہیں کاشت کار، کہیں کھیت مزدور کی صورت میں تو کہیں کمی کمین کے روپ سے، اس احتجاج کے پیچھے ندیم کا حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔ افسانہ ''ثواب'' میں بھی جاگیرداری نظام کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں ملک رحمان خان کے غیر انسانی اور ظالمانہ کردار کو پیش کیا گیا ہے جب بیوہ کرماں کا اکلوتا سہارا کنویں میں گر جاتا ہے تو اس ہولناک حادثے کا اثر اس جاگیر پر نہیں ہوتا بلکہ اسے تشویش ہوتی ہے کہ کنویں کو صاف کرنے کے لیے چالیس ڈول پانی نکلوانا پڑے گا:

"لاش نکل آئی ہے تو کنویں کو پاک بھی کر لینا چاہیے، دو سو بو کے نکالنے ہوں گے، تم جھیو رلوگ بو کا خوب کھینچتے ہو، اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر یہ ثواب کا کام بھی ہے۔"۲۹

غرض افسانہ "ثواب" ظلم واستبداد کی علامت ہے وہ استحصالی قوتیں جو معاشرے کو تباہ و برباد کرتی ہیں، عام لوگوں کا خون پی کر زندہ رہتی ہیں اُن کا بہترین نمونہ ہے۔

افسانہ "شیش محل" میں ندیم نے ملک صاحب کے محنت کش دشمن اور ظالم کردار کو بے نقاب کیا ہے، اس کے ساتھ ہی سیاسی وسماجی جبر کی بازگشت میں محنت کی عظمت کو بڑی فن کاری سے واضح کیا ہے۔ کہ محنت کرنے والا ہاتھ عزت و وقار کے لیے جدوجہد کرنے والا بازو کم زور نہیں ہوتا۔ بشکو نے شیش محل کے خواب دیکھنے اور اس کی تعمیر کرنے کا حوصلہ کہاں سے سمیٹا؟ بشکو ہمت نہیں ہارتا کیوں کہ وہ چاہتا ہے کہ:

"اس کی زندگی میں ایک دن وہ بھی آئے گا کہ وہ ملک صاحب سے کہہ سکے 'ملک جی! اب شرم کا ہے کی کردں؟ اب تو میرا شیش محل میرا اپنا شیش محل ہے۔"۳۰

افسانہ "سلطان" کا شمار ندیم کے علامتی افسانوں میں ہوتا ہے۔ اور یہاں پر "سلطان" دوسری جنگِ عظیم کے بعد رونما ہونے والے آشوب کی ترجمانی کے علاوہ قدیم و جدید کے ٹکراؤ اور آویزش کی علامت ہے۔ اس علامتی روپ میں ماضی، حال اور مستقبل آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دکھانا بہت مشکل ہے اور نئی قدروں کا وجود ابھی تک زیادہ تر اشتہاری ہے۔ آزادی رائے، اقتصادی مساوات، سیاسی انصاف، عالم گیر برادری اور معاشی عدل کی باتیں صبح سے شام تک چلتی رہتی ہیں، مگر دنیا میں کہیں بھی ان کا عملاً وجود دکھائی نہیں دیتا۔

۱۹۶۰ء کے بعد ملک کی سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر کئی دہائیوں تک فوجی آمریت کے سائے ملکی سیاست پر چھائے رہے، جو نہ صرف جمہوری اقدار بلکہ قوم کی ترقی میں بھی رکاوٹ کا باعث بنے۔ ۱۹۶۵ء میں صدارتی انتخاب کے موقع پر ایوب خان کے انتخابات جیتنے کی خوشی میں کراچی کے اندر مادرِ ملت کے حامی غریبوں اور حاجت مندوں کی بستیوں پر وحشت و بربریت کا ہلہ بول دیا گیا تو ندیم نے اس وقت ان غریبوں اور دکھ کے مارے لوگوں کی حمایت کی۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے پوری قوم کو ایک مرتبہ پھر تباہی کے دہانے لا کھڑا کر دیا تو ندیم نے سیاسی جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی روایت برقرار رکھی اور آمریت کی کسی بھی شکل خواہ مذہبی ہو یا سیاسی کے خلاف جدوجہد کا حوصلہ پیدا کیا۔

ندیم کو ہر لحہ یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک کے لکھنے والے ہیں، جس نے ابھی نوآبادیاتی نظام سے نجات حاصل کی ہے اور جسے نئے سیاسی، معاشی اور تہذیبی مسائل درپیش ہیں۔ اس

حوالے سے ڈاکٹر حنیف فوق یوں لکھتے ہیں:

''اس ملک سے غربت کا خاتمہ، بیرونی سازشوں کا سدباب، تہذیبی منزل کی دریافت، صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ منصفانہ نظام معاش، علاقائی ترقی و بہبود کے ذریعہ علاقائی عصبیتوں کا ازالہ اور ایک مجموعی سیاسی اکائی کی جستجو ایسے مسائل ہیں جن کا جمہوری حل ہر صاحب نظر کے لیے دعوتِ فکر بھی ہے اور چیلنج..... احمد ندیم کے افسانوں اور شعروں میں ہمیں برابر اس فکر کے اثرات ملتے ہیں۔''[۳۱]

غرض ندیم کے ہاں ہمیں علاقائی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر قومی منزل کی تلاش کا رجحان واضح نظر آتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اسی پر باقی ماندہ پاکستان کے استحکام کی بقا کا انحصار ہے۔ ندیم کے ہاں کسی بھی موقع پر حب الوطنی کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ جس کی واضح مثال ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران ۶ ستمبر کے بھارتی حملے پر ندیم کا ایک شعلۂ جوالہ کی صورت بھارتی سامراجیت پر برس پڑتا ہے اور یہ ندیم کی حب الوطنی کا ہی کرشمہ ہے کہ جب ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہندوستان نے پاکستان پر جارحانہ حملہ کیا تو وہ پکار اٹھے۔

میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں ، افلاک کی دہشت ہوں میں

ندیم نے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے حالات و واقعات اور اثرات کا حوالہ اپنے افسانوی مجموعے ''کپاس کا پھول'' میں شامل افسانہ ''کپاس کا پھول'' میں نہایت فن کاری سے بیان کیا ہے۔ یہ افسانہ پاک سرزمین پر انڈین فوج کی ظالمانہ کارروائیوں سے متعلق ہے۔ افسانہ ''کپاس کا پھول'' میں جنگ کے بارے میں عام جذباتی رویے سے ہٹ کر مائی تاجو کو تمام قوم کے عزم و ہمت کے لیے ایک بلیغ استعارہ بنا دیا گیا ہے۔ افسانہ ''کپاس کا پھول'' میں لاہور سے قریب سرحد پر ایک گاؤں کی دیہاتی زندگی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں ایک دن اچانک ہندوستانی فوج نے حملہ کر دیا، جس کی وجہ سے ہر طرف گولیوں کی آواز اور دھواں اٹھ رہا تھا اور ہر طرف لاشوں کے انبار نظر آ رہے تھے۔ ان حالات میں مائی تاجو اپنی جان بچاتے ہوئے کھیتوں میں پناہ لیتی ہے تو اسے راختاں نظر آتی ہے، مگر وہ برہنہ ہوتی ہے اور مائی تاجو کا کفن اُس کا لباس بن جاتا ہے۔

افسانے میں کپاس کا پھول ایک خوب صورت استعارہ کی صورت میں افسانہ کی روح میں جلوہ گر ہے۔ کپاس کے پھول سے لٹھا بنتا ہے اور اس لٹھے سے کفن تو یہی کفن مائی تاجو اپنے لیے سنبھال رکھتی ہے۔ لیکن یہ راختاں کی عریانی ڈھانپنے کے کام آتا ہے۔ جس کو لپیٹ کر وہ ظلم کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ ایک نئے عزم سے نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے:

''کفن پر جگہ جگہ خون کے دھبے نمایاں ہونے لگتے تھے۔ نوچی کھسوٹی راختاں کا جسم اپنا کرب کفن پر منتقل کر رہا تھا اور خاک پاک نے اس خون کے لیے جگہ خالی کر دی تھی۔''[۳۲]

غرض افسانہ ''کپاس کا پھول'' جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے پس منظر اور پیش منظر کو واضح کرتا ہے۔ ندیم نے ۱۹۶۵ء کے سانحے کا ذکر نہ صرف اپنے افسانوں میں کیا بلکہ اپنی شاعری اور مضامین کے ذریعے بھی نہایت خوب صورتی سے کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''جس جرات و حوصلہ مندی و بے باکی سے احمد ندیم قاسمی نے چھے ستمبر انیس سو پینسٹھ کی جنگ کے بارے میں مضامین لکھے تھے کسی اور ادیب و دانش ور کے قلم سے نہیں نکلے۔''[۳۳]

قیام پاکستان کے بعد سیاست میں جو موجود شعبدہ بازیاں پروان چڑھ کر قوم کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر رہی ہیں، وہ سب ایک محبِ وطن فن کار کے لیے ہمیشہ باعث تشویش رہی ہیں۔ لہٰذا معاشرے میں پروان چڑھنے والی کینہ پروری، رشوت ستانی، خود غرضی اور مال و دولت جمع کرنے کی دھن، اور سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ بیوروکریٹس اور تاجروں نے جو لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔ ان سب کو ندیم جیسے حساس اور محبِ وطن فن کار نے اپنے افسانے ''سفید گھوڑا'' میں بے نقاب کیا ہے۔

افسانہ ''سفید گھوڑا'' میں ندیم نے پاکستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے سول بیوروکریٹس اور تاجروں کے بھیانک کرداروں کی عکاسی کی ہے کہ ان بیوروکریٹس اور تاجروں کے اشتراک سے ایسے ہوٹل اور فلیٹ وجود میں آ چکے ہیں جہاں پر غلط کام سرزد ہو رہے ہیں۔ کیوں کہ رزق حرام اور اختیارات کی بدمستی اس معاشرے میں عروج پر ہے۔ جہاں اکثریت اپنی بنیادی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے تاجروں کی خاطر ماؤں کو اپنی ان بیٹیوں کے نام ہر سال بدلنے پڑتے ہیں جن کو بکنا ہوتا ہے:

> ''وہ اپنے بھیگے ہوئے گال میرے پاؤں پر رگڑنے لگی اور فریاد کرنے لگی، میرا پردہ رکھ لیجیے صاحب، میرا اور میری بیٹی کا پردہ خدا کے اور آپ کے ہاتھ میں ہے، میں کیا کروں صاحب، میری ایک ہی بیٹی ہے مگر سب نئی بیٹی مانگتے ہیں۔''[۳۴]

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی لوٹ مار، سیاسی کشمکش اور اقتدار کی چھینا جھپٹی اس قوم کا مقدر ہو گئی اور ساتھ ہی مارشل لاء کے نفاذ نے شخصی آزادی کے تصور کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اقتدار کے شائق سیاست کار ٹولے کے اسی شوقِ حکمرانی نے ملک کو آزادی کے صرف تئیس (۲۳) برس بعد دولخت کر دیا اور بنگلہ دیش کے وہ عوام جنھوں نے تحریک آزادی میں دیگر مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی تھی اسی ظلم و استحصال اور بے اعتدالی کے سبب علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

احمد ندیم قاسمی ایک حساس محبِ وطن انسان تھے جو اپنے ملک کے تمام لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور یہی حب الوطنی و سوزِ وطن کے تاثرات ان کے ہاں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ تاثرات نہ صرف ۱۹۶۵ء کی

جنگ میں گہرے ہوتے گئے، بلکہ سقوط ڈھاکہ کے المیے پر غم کی شدت میں اضافہ اور اچانک پن کا احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ پاکستان سے ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ پاکستانیوں پر بنگلہ دیش میں قہر ٹوٹا اور ان کا نام بہاری پڑا، سیاسی ہلڑ بازی اور چیخ و پکار ان سب المیوں کا اظہار ندیم نے نہایت چابک دستی سے اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ اس کی واضح مثال ان کے افسانوی مجموعہ ''نیلا پتھر'' میں شامل افسانہ ''اندمال'' ہے۔

افسانہ ''اندمال'' میں سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان پہنچنے والے بہاری پناہ گزینوں کے لٹنے اور اپنے اثاثوں سے محرومی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اندمال'' بھی اس دردناک تاریخی صداقت کی گواہی ہے کہ ہجرت سے آباد ہونے والے پاکستان میں یہ پرصعوبت سفر (ہجرت کا) اور 'جائے امان' میں پہنچ کر ان کا لٹنا اور اس اثاثے سے بھی محروم ہو جانا جو بلوائیوں کی لوٹ مار سے بچ گیا تھا۔ یہ بھی ۱۹۴۷ء کی ہجرت کا معنوی تسلسل ہے۔''[۳۵]

اس افسانے میں ندیم بہاری پناہ گزینوں کے ایک ایسے خاندان کی سرگزشت بیان کرتا ہے، جو ہجرت کر کے پاکستان پہنچتا ہے تو اس خاندان کو ایک طرف جلال الدین جیسے سچے ہمدرد اور خیر خواہ ملتے ہیں تو دوسری طرف وہ چوروں کے ہاتھوں لٹ جاتا ہے۔ ندیم کا اس افسانے میں ان دونوں طبقات کی طرف واضح اشارہ نظر آتا ہے۔ جن میں سے ایک بہاری مہاجرین کو پاکستان میں جگہ دینے کے حق میں تھا اور دوسرا طبقہ اس کے مخالف تھا۔ افسانے میں نزہت کا شوہر اشرف مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان موجود رشتے کی علامت ہے اور اس کی تصویر کا غائب ہو جانا اس رشتے کے انقطاع کو ظاہر کرتا ہے:

> ''آپ کو پتا نہیں ابا جی، نزہت بہت پراسرار انداز میں جیسے، راز کی کوئی بات بتاتی ہوئی بولی ہم ابھی تک ڈھاکہ میں ہیں اور اشرف سچ مچ مر گیا ہے اور مارنے والے اس کی لاش بھی اٹھا کر لے گئے ہیں۔''[۳۶]

ندیم کے افسانوں کے مطالعے سے مکمل پاکستانی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ تحریکِ خلافت، تحریک پاکستان، فسادات و ہجرت کے مسائل، آزادی کے بعد سیاسی مسائل، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے المیے سب کو ان کے افسانوں میں نمائندگی حاصل ہے۔ ندیم کے افسانوں میں مرکزیت اس کے افسانوی کرداروں کے بجائے وہ سماجی و سیاسی حالات ہیں جن میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان سماجی، سیاسی و اقتصادی حالات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے ایک ایسی غیر طبقاتی، سیاسی و سماجی تنظیم کا قیام تجویز کر کے ان کا حل تلاش کرتا ہے۔ جس میں کسی فرد، قوم یا طبقے کا کسی بھی حوالے سے استحصال نہ ہو۔ ڈاکٹر سعادت سعید کے نزدیک:

> ''چوپال'' سے لے کر ''کپاس کا پھول'' اور ''نیلا پتھر'' کے افسانوی مجموعوں میں انھوں نے دیہات

اور شہری زندگی کے بے شمار اہم مسائل کو گرفت میں لیا ہے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لوگ انھیں پڑھنے کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ یہ سب کچھ تو ہم نے بھی محسوس کیا ہے۔ جو کچھ قاسمی صاحب نے لکھا ہے۔'' ۳۷؎

ندیم کے آخری افسانوی مجموعہ ''کوہ پیما'' ۱۹۹۵ء میں بھی ندیم کے سیاسی شعور کی جھلکیاں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہیں۔ ''کوہ پیما'' کے ٹائٹل سے منسلک فلیپ ہندوستان کے معروف نقاد ڈاکٹر قمر رئیس کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں مختصر انداز میں قاری کی توجہ ندیم کے افسانوں کی بنیادی خصوصیات کی طرف مبذول کروائی گئی ہے:

''تقسیم سے اب تک ندیم نے انسان دوستی کے بلند نصب العین کو عزیز رکھا، خواہ وہ فرقہ ورانہ کشت وخون ہو، مہاجرین کی الم ناک زندگی کے مسائل ہوں، کسان اور جاگیرداروں کی جنگ ہو، سیاسی عدم استحکام کی لعنتیں ہوں، یا مغربی سرمایہ کے ساتھ اس کے ذہن واحساس اور کلچر کی یلغار ہو، ندیم نے اپنی کہانیوں میں جاگیردار اور اُبھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقہ کے رخ سے نقاب اتار کر اس بہیمیت کو عریاں کر دیا ہے۔'' ۳۸؎

اس مجموعہ میں شامل افسانہ ''پیپل والا تالاب'' میں ندیم نے قیام پاکستان کے بعد معاشرت، ثقافت، تاریخ، سیاست اور روایات کو سطحی انداز میں مسلمان بنانے کی کوششوں پر طنز کیا ہے۔

ندیم کے افسانوں میں اردو افسانہ کی پوری روایت نظر آتی ہے۔ انھوں نے سیاسی وسماجی حالات کا مطالعہ نئے زاویۂ نظر سے کیا۔ ندیم کی ملکی سیاسی صورت حال پر گہری نظر ہے جو ان کے فن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بلکہ تقریباً ہر اہم سیاسی واقعے کے متعلق کوئی نہ کوئی افسانہ مل جاتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں شروع سے لے کر آخر تک نظر دوڑائی جائے تو سیاسی شعور کا رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور نظر آتا ہے اور تقسیم ہند کے بعد تو اُن کا سیاسی شعور اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے کیوں کہ ملکی صورت حال پر ان کی نظر بہت گہری ہونے کی وجہ سے فن میں اس کی پیش کش بہت زیادہ اہم ہے۔ ندیم کے سیاسی شعور کی بڑائی یہ ہے کہ وہ انتہائی تاریکی میں بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ فن کے ذریعے زندگی کی روشنی کے اظہار، جمہوریت کے اثبات اور سیاسی وتہذیبی عناصر کی تشکیل کے استحکام کا کام نہایت خوبی سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر امید کا پیغام دیتی ہے۔

حواشی:

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، بحوالہ ''ترقی پسند اردو ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ'' ڈاکٹر سیما صغیر، ص ۱۶۷۔

۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر ''تنقیدی زاویے''، ص ۲۷۴۔

۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''افق''مشمولہ ''آس پاس'' اساطیر پبلشر لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۵۱۔

۴۔ ایضاً ص ۵۱۔

۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''تکمیل''، مشمولہ ''مجموعہ احمد ندیم قاسمی''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۴۔

۶۔ محمد عباس طوری، ''احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک''، پاکستان رائٹرز سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۹۔

۷۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۸۔

۸۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''افسانہ اور افسانے کی تنقید''، ایضاً ص ۱۸۰۔

۹۔ احمد ندیم قاسمی، ''نیا فرہاد'' مشمولہ ''درو دیوار''، اساطیر پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۵ء ص ۲۸۔۲۹۔

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''تسکین''، مشمولہ ''درو دیوار''، ص ۳۶۔

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''جب بادل امڈے''، ص ۵۰۔

۱۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''سپاہی بیٹا''، مشمولہ: ''درو دیوار''، ص ۶۲۔

۱۳۔ فتح محمد ملک '' احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار''، ص ۱۲۹۔

۱۴۔ ڈاکٹر انوار احمد، ''افسانہ: قصہ ایک صدی کا''، ص ۲۹۵۔

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''ووٹ''، مشمولہ: ''درو دیوار''، ص ۴۷۔

۱۶۔ ایضاً ص ۹۰۔

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی: ''کہانی لکھی جا رہی ہے''، مشمولہ ''درو دیوار''، ایضاً ص ۱۱۱۔

۱۸۔ احمد ندیم قاسمی: ''راجے مہاراجے''، مشمولہ ''درو دیوار''، ایضاً ص ۱۳۹۔

۱۹۔ اختر حسین رائے پوری: ''افکار، ندیم نمبر، جنوری فروری ۱۹۷۵ء، ص ۳۶ ۔

۲۰۔ لبنیٰ انصاری: ''سناٹا ہماری قومی انفعالیت کا استعارہ'' مشمولہ سہ ماہی ادبیات، جلد ۱۷ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۶ء، ص

۲۱۔ ڈاکٹر شفیق انجم، ''اردو افسانہ''، ص ۱۱۷۔

۲۲۔ احمد ندیم قاسمی: ''بڑی سرکار کے نام''، مشمولہ ''سناٹا''، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۱۹۔

۲۳۔ احمد ندیم قاسمی: ''مامتا''، مشمولہ: ''سناٹا''، ایضاً ص ۱۰۵۔

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی: ''پرمیشر سنگھ''، مشمولہ: ''بازارِ حیات'' اساطیر، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۷۔

۲۵۔ پروفیسر قیصر نجفی، ''ایک بڑا انسان، ایک بڑا تخلیق کار''، مشمولہ ''نذر ندیم''، سہ ماہی مونتاج، لاہور، شمارہ ۱۰، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷۵۔

۲۶۔ احمد ندیم قاسمی: ''وحشی عورت''، مشمولہ: ''برگ حنا'' ناشرین پبلشرز، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۱۳۵۔

۲۷۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ''ندیم اور علامتی افسانہ''، مشمولہ: ''افکار'' ندیم نمبر، جنوری، فروری ۱۹۷۵ء، ص ۳۶۴۔

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی: ''اصول کی بات''، مشمولہ: ''مجموعہ احمد ندیم قاسمی''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۱۴۰۔

۲۹۔ احمد ندیم قاسمی: ''ثواب''، مشمولہ ''گھر سے گھر تک''، ص ۴۳۔

۳۰ احمد ندیم قاسمی، ''شیش محل''، مشمولہ، ''گھر سے گھر تک''، ص ۱۳۰۔
۳۱ ڈاکٹر حنیف فوق، ''فن اور رابطۂ عصر''، مشمولہ، ''افکار'' ماہ نامہ کراچی، ندیم نمبر، ص ۳۲۷۔
۳۲ احمد ندیم قاسمی، ''کپاس کا پھول''، مشمولہ، ''کپاس کا پھول''، مکتبہ فنون لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۷۷۔
۳۳ ڈاکٹر جمیل جالبی، ''بے مثال: احمد ندیم قاسمی''، سہ ماہی ''معاصر'' انٹرنیشنل، ۲۰۰۸ء، ص ۴۷۔
۳۴ احمد ندیم قاسمی، ''سفید گھوڑا''، مشمولہ، ''کپاس کا پھول''، ص ۱۹۱۔
۳۵ ڈاکٹر انوار احمد، ''اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ''، ص ۳۰۹۔۳۱۰۔
۳۶ احمد ندیم قاسمی، ''اندمال''، مشمولہ، ''نیلا پتھر''، اساطیر پبلشر، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۵۸۔
۳۷ سعادت سعید، ڈاکٹر، ''حقیقت نگاری یا جدلیاتی ستارے''، سہ ماہی ''معاصر'' انٹرنیشنل، ۲۰۰۵ء ص ۸۴۔
۳۸ احمد ندیم قاسمی، ''کوہ پیما'' سرورق، فلیپ، اساطیر پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۵ء۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ۲۰۱۰، ''افسانہ: قصہ ایک صدی کا''، مثال پبلشرز، فیصل آباد۔
۲۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر: سن ندارد، ''تنقیدی زاویے''، عشرت پبلی کیشنز، لاہور۔
۳۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر: ۱۹۷۲ء، ''افسانہ اور افسانے کی تنقید''، مقبول اکیڈمی، لاہور۔
۴۔ سیما صغیر، ڈاکٹر: سن ندارد، ''ترقی پسند اردو ہندی افسانے کا تقابلی مطالعہ''، جامعہ ملیہ، دہلی۔
۵۔ طوری، عباس، محمد: ۲۰۱۰ء، ''احمد شاہ سے احمد ندیم قاسمی تک''، پاکستان رائٹرز سوسائٹی، لاہور۔
۶۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۵۲ء، ''سناٹا''، نیا ادارہ، لاہور۔
۷۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۵۹ء، ''بازارِ حیات'' اساطیر، لاہور۔
۸۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۵۹ء، ''برگ حنا'' ناشرین پبلشرز، لاہور۔
۹۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۷۳ء، ''کپاس کا پھول''، مکتبہ فنون لاہور۔
۱۰۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۹۵ء، ''آس پاس'' اساطیر پبلشر، لاہور۔
۱۱۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۹۵ء، ''در و دیوار''، اساطیر پبلشرز، لاہور۔
۱۲۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۹۵ء، ''نیلا پتھر''، اساطیر پبلشر، لاہور۔
۱۳۔ قاسمی، احمد ندیم: ۱۹۹۵ء، ''کوہ پیما''، اساطیر پبلشرز، لاہور۔
۱۴۔ قاسمی، احمد ندیم: ۲۰۰۸ء، ''مجموعہ احمد ندیم قاسمی''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۱۵۔ قاسمی، احمد ندیم: سن ندارد، ''گھر سے گھر تک''۔
۱۶۔ ملک، فتح محمد: ۲۰۰۷ء، ''احمد ندیم قاسمی: شاعر اور افسانہ نگار'' سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

رسائل:

۱۔ ماہ نامہ ''افکار'' کراچی، ندیم نمبر، جنوری، فروری ۱۹۷۵ء۔

۲۔ سہ ماہی ''ادبیات''، اسلام آباد، جلد ۱۷/ اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۶ء۔

۳۔ سہ ماہی ''معاصر'' انٹرنیشنل، لاہور، ۲۰۰۵-۲۰۰۸ء۔

۴۔ سہ ماہی ''مونتاج''، لاہور، شمارہ ۱۰، لاہور، ۲۰۰۷ء۔